

ڈاکٹر طاہرہ اقبال

شعبہ اردو

جی سی ویمن یونیورسٹی۔ فیصل آباد

## گلزار کی ڈیوڑھی کے دالان

"This is a collection of Short Stories of Gulzar "Devdhi" meaning that it is the beginning of details of such homes, where past & present eras lived and inhabitants breathed. Decade of past & present lived. Many known & unknown faces met each other, a lot of nears & fars embraced each other."

ایک معروف اور مصروف رستے پر گامزن ہونا سہل سہی کہ اُس راہ کے کنکر پتھر کئی پیش رو چن چکے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کشادہ اور معلوم سڑک کو چھوڑ کر اپنے لیے الگ پگڈنڈی کھوجنا کارِ دشوار لیکن سارے چشمے، برساتی نالے ٹیرسنگ کھیت خود رو پھول پھل اور انوکھی وارداتیں انہیں پگڈنڈیوں کا حصہ ہیں۔

گلزار صاحب کی کہانی انہی پہاڑی پگڈنڈیوں کا مہم جو سفر ہے۔ جہاں منفرد ذائقے کے پھل پھول تیز موڑ اور جھنجھوڑ دینے والے مقامات آہ و فغاں بہت ہیں یعنی کسی برگد کے پرانے پھڑتلے یاد کے ٹمٹماتے دیئے۔ منقطع رفاقتوں کے سلگتے میٹھا میٹھا درد چھوڑتے پرانے زخم جو ٹھنڈی راتوں میں ٹیس بن جاتے ہیں۔ کاسمو پولیٹن شہر کی ریزگیاں۔ مابعد جدیدیت کا لا انسان اور مابعد انسانیت عالمگیریت کے خفیہ منصوبے کی تکمیل کا ایندھن بنتی ہوئی بے وقار تیسری دنیا اور پہلی دنیا کے Its others کا دبا دبا احتجاج اور مہذب طنز، دریدہ کے ردِ تشکیل سے ہو کر گزریں تو اس محشر خیال میں معنی کی اتنی پرتیں اور مطالب کی اتنی تہیں ایک کے بعد دوسری کھلتی چلی جاتی ہیں کہ سب کا احاطہ ایک مضمون کا متحمل نہیں۔ سو صرف گلزار کی ڈیوڑھی سے ہو کر دالان میں تھوڑا جھانکتے ہیں۔

یہ ہے گلزار کے افسانوں کا مجموعہ ڈیوڑھی یعنی ڈیوڑھی نقطۂ آغاز ہے ایسے گھر کی تفصیلات اور وسعتوں کا جس میں کئی گذشتہ اور حاضر کے عہد اور مکین سانس لیتے ہیں۔ ماضی و حال کے کئی دہا ہے جیتے ہیں۔ کئی شناسا اور نیم شناسا چہرے ملتے ہیں۔ کئی دوریاں اور قربتیں گلے لگتی ہیں۔

بلاشبہ وہی ادیب ادب کی دائمی زندگی کو حیات ہے۔ جو دوسروں کے پانیوں سے سیراب نہیں ہوتا بلکہ اپنا کنواں خود کھودتا ہے۔ گلزار صاحب بنے بنائے رستوں کے راہی نہیں ہیں۔ وہ اپنے نقش پا سے اپنا راستہ خود بناتے ہیں ان پگڈنڈیوں اُن رستوں کا سراغ لینے کو اک عمر کی سیاحت درکار ہے۔ اسی لیے ڈیوڑھی سے جھانکنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ اس مکان کے آٹھ مالے ہیں ہر منزل کے در پر ایک تختی آویزاں ہے۔ ہر تختی اپنے مکینوں کا تعارفیہ پیش کرتی ہے۔ پہلی تختی پر یہ تعارفیہ کچھ یوں درج ہے:

کتابوں سے کبھی گزرو تو یوں کردار ملتے ہیں

گئے وقتوں کی ڈیوڑھی میں کھڑے کچھ یار ملتے ہیں

ساحر اور جادو

کلدیپ نیر اور پیر صاحب

بھوشن بنمالی

موجود اور معروف افراد کو افسانوی کردار بنا دینا گلزار صاحب کی وہی جداگانہ روش پر گامزن ہونے والی خصلت کی دلیل ہے۔ بظاہر آسان نظر آنے والی یہ تکنیک یوں آسان نہیں ہے کہ افسانے کا خاکے میں ڈھل جانے کا احتمال موجود رہتا ہے افسانے کا مخصوص اسرار اور ذومعنویت کے مجروح ہونے کا خطرہ بھی رہتا ہے۔ لیکن گلزار کے ہاں عجب ماجرہ ہے کہ حقیقت اسرار کی چلمن بن جاتی ہے جس میں سے زندگی اپنی تمام تر سنگینیوں کے باوجود اک رومانی چھب دکھاتی ہے۔ اسی لیے انتظار حسین کہتے ہیں:

”گلزار صاحب کی کہانیاں سہل ممتنع کی مثال ہیں۔ سہل اور سادہ مگر ایسا سہل اور سادہ کہ کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے۔“ (۱)

گئے وقتوں کی ڈیوڑھی میں کھڑے یہ چار یار چوتھا خود مصنف کہ کہانی کے سارے رنگ اسی چوتھے کھونٹ کے اندر سموئے رہتے ہیں۔ ہاں تو یہ یار اگرچہ خود تاج محل سے ہیں لیکن جمنہ کے کنول کی کٹوری میں بند جگنو کی طرح انہیں جزو افسانہ کر دینا گلزار صاحب کے اعلیٰ درجے کا معمار ہونے کی دلیل ہے مثال دیکھئے:

”یہ ساحر کی میت اٹھنے سے پہلے کی بات ہے۔“ پہلا جملہ حقیقت نگاری لیکن اگلا جملہ زبردست افسانہ۔  
”میں بات جادو کی سنا رہا ہوں اور ذکر ساحر لدھیانوی کا ہے۔“

پورا افسانہ اسی حقیقت اور افسانے کی لکن میٹی، چھپن چھپائی کا دلچسپ کھیل ہے۔ عام سے معمولی سے لفظ جب گلزار کے نوکِ قلم سے مس ہوتے ہیں تو اپنی ہیئتِ ترکیبی بدل ڈالتے ہیں۔ ان عام سے لفظوں کے اندر سوئے پڑے نامعلوم سے مطالب بیدار ہو جاتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کا خیال ہے:

”گلزار پُر فریب فنکار ہے ہر قدم پر جل دے جاتا ہے ہر کہانی کے ساتھ زندگی کا اور زندگی کے تجربے کا افق بدلتا ہے اور وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔“ (۲)

”مزاج شاعرانہ بھی ہے اور باغیانہ بھی۔۔۔ پوری Pedigree ایسی ہے۔ باپ جاں نثار اختر، ماموں مجاز اور اب سرسکینی عظمیٰ۔۔۔“

افسانے کا ہر جملہ خود میں اقتباس ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسی تحریر لکھنا جگر کا دی اور عرق ریزی لیکن ایسا محسوس تو ہرگز نہیں ہوتا۔ لگتا ہے نوکِ قلم سے الفاظ خود رو پھوٹ پڑے ہیں اُس جادوگر کے شعبدے کی طرح جو تماشاخیوں کے بیچ چھری لہراتا ہے۔ لیکن جب کسی ماتھے پر چھری کا وار کرتا ہے تو تیز دھار پر پھول کھل اٹھتا ہے۔ ایسے اچنبھا بھرے پھول بہت کھلائے ہیں گلزار نے، جیسے کلدیپ نیر کے پیر صاحب برگد کے پرانے پیڑ سے پھوٹ نکلتے ہیں۔ جو ہر کڑے وقت میں یادوں کی ڈیوڑھی میں کھڑے ملتے ہیں اور بنفشے کی خوشبو کی مانند سارے میں بکھر جاتے ہیں جوہ تو سرحد کے اِس طرف گئے ہیں لیکن اُس پار کی ڈیوڑھی میں اپنا مچ چانے دھونی دھانے سے انہیں کون سی حکومت، کون سا ویزہ روک سکتا ہے۔ وہ تو تہاڑ جیل کو بھی اپنے قول کا بندی بنا گئے تھے کہ نیر صاحب کو قید و بند کی صعوبتوں سے

غرض نہیں ہے بس پیر صاحب کو کسی صورت جھوٹا پڑتے نہ دیکھنا چاہتے تھے اور یہ خواہش بڑی شدید ہے یعنی سرحدوں کو ٹاپ لینے کی تمنا کو اسرار کے قدموں کی چاپ لگی ہے۔ میں سفاکانہ تنقیدی زبان میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کر پاتی کہ پیر صاحب اس مشترکہ کلچر، بے تعصبی اور پراسرار روحانیت کی علامت تھے۔ جو تقسیم کے وقت جینے والے اپنے وجود میں سمو کر ادھر ادھر ہمراہ لے گئے اور اب یہ خواب اور ہیولے واسطے اور محسوسات، فینٹسی اور متھ ان کے وجود میں سدا جیتے ہیں، جیسے انڈے بچے گھونسلوں میں جیتے ہیں اور باہر کی گرم ہواؤں میں مر جاتے ہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ اسرار کے موہوم سے پردے اس ڈیوڑھی کے ہر ایوان میں سرسراتے ہیں جیسے شہیل کے ہرے تھان ہولے ہولے کھلتے ہوں جیسے کوئی مقدس کتاب لوہان رچے غلافوں میں بستی ہو، جیسے کسی درگاہ پر مٹی کا کوئی دیا ٹمٹاتا ہو، لیکن کسی پر کچھ اختصاصی رقم نہ ہو بس اک روحانی سی چھاپ جو کسی رنگ کسی عقیدے سے مماثل نہ ہو خود گلزار کی طرح، پیر صاحب کی طرح، کلدیپ نیر کی طرح اتنے صاف دو ٹوک اور یک پرت۔ جیسے بھوشن بنمالی۔

”کہاں رہو گے میں نے پوچھا تھا۔۔۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ یہیں جب نکال دو گے تب سوچوں گا کہاں جانا ہے۔“

قربتوں محبتوں اور گچ جذبوں کے یہ تاج محل اپنے اپنے مدفونوں کی عظمتوں کے گواہ ہیں۔ اس ڈیوڑھی کا دوسرا ایوان ممبئی نگری کی سمت کھلتا ہے۔ عمر بھر ممبئی اتنا پڑھا کہ زبانوں پر ممبئی چڑھتا ہی نہیں ہے لیکن اب سچ ممبئی ہے اور ممبئی ممبئی تو ہونی نہیں سکتا اسی لیے بہت مختلف آرٹ ہے وہاں جی جانا جہاں حالات کچھ یوں ہیں:

”سر پانی میں اور پاؤں زمیں پر۔۔۔۔۔ یہ نگری ممبئی کی ہے۔“

”تو اسے بستی بولتا ہے آدمیوں کا گودام لگتا ہے سب کو پارسل میں پیک کر دیا ہے۔“

یعنی ترقی کے نام پر قید، آزادی کی جدید گھٹن، جملے ہیں کہ اوک بھر پانی جس کے ڈالنے سے پورے سمندر کا پتہ ملتا ہے۔ ایسا کھارا اور عمیق سمندر کہ دو گھونٹ تالو سے سینے تک آبلے بنا ڈالیں۔ اتنا گہرا کہ جہازوں کو بھی اپنی کوکھ میں سمو لے ایسے ہی چند سمندر جملے ملاحظہ ہوں:

”یہ بھی سالی کوئی زندگی ہے۔ ڈریوں میں بند کر دیا ہے سرکار نے پتہ ہے کیوں تاکہ غربتی کا باس باہر نہ جائے۔“

ایک ان پڑھ جھونپڑ پٹی کی عورت کے منہ سے مابعد جدیدیت کے ایسے نقطے مفسر ہوئے ہیں کہ اگر پہلی دنیا کا کوئی مفکر یہ فلسفہ پیش کرتا تو تیسری دنیا کی یونیورسٹیوں کے نصاب کا حصہ بنا لیا جاتا۔

چھوٹے نچلے طبقے کے ذرا ذرا پیسوں اور دیمک جیسے دکھ، سادوں کے پھوڑوں جیسے پپ رستے مجھڑ اور کھیلوں جیسے غلاظتوں میں منہ دھنساتے ہوئے حشرات الارض لہوچوستے جونک، خیال آتا ہے۔ گلزار بالی وڈ کا ایک مہمان نام، اس فلم نگری کے مہمان کردار اور محلات کی شاہی زندگیاں جو مصنف کے گرد و پیش پھیلی ہیں وہ متاثر کیوں نہ کر سکیں اس چکا چونڈ میں بھی نگاہیں چوکور ماما، جامن کا پیڑ، فٹ پاتھ، باس اور جھڑی جیسی ریز گیوں کو ہی کیوں چن لیتی ہیں۔ خود کہتے ہیں:

”نظم ہو یا افسانہ ان سے علاج نہیں ہوتا وہ آہ بھی ہیں۔ سچ بھی دہائی بھی مگر انسانی دردوں کا علاج

نہیں ہیں وہ صرف انسانی دردوں کو میا کر رکھ دیتے ہیں تاکہ آنے والی صدیوں کے لیے سند

رہے۔“ (۳)

گلزار کی کہانی آنے والی صدیوں کے لیے سند ہے۔ وہ زندگی کو صفحہ قرطاس پر یوں دھڑکتا ہوا وجود بخش دیتی ہے جیسے ہم لفظوں میں سے نہیں پڑھ رہے بلکہ اس زندگی کی متحرک تمثیل کو سکریں پر دیکھ رہے ہوں۔  
 ”باندہ کے اس فٹ پاتھ پر ہیرا سب سے الگ چیز تھی بہت کچھ کر لیتی تھی۔ سورج سے پہلے اٹھتی تھی اور دو گھنٹے میں کھار باندہ کے آدھے سے زیادہ کچرے کے ڈبے چھان آتی تھی۔ ڈبہ ڈھکن جو ملتا بوری میں ڈال لیتی تھی ایک دو بیڑ کی بوتلیں مل جاتیں تو اچھے پیسے بن جاتے تھے ورنہ آج کل تو مالک لوگ ردی کے پیپر بھی خود ہی بیچتے تھے۔“ (۴)  
 ایسے دہلا دینے والے طنز سے یہ کتاب بھری ہے۔ اس ڈیوڈھی کے تیسرے مالے کا سرناواں ہے۔  
 ”آنکھوں کو ویزہ نہیں لگتا سپنوں کی سرحد ہوتی نہیں

بند آنکھوں سے روز میں سرحد پار چلا جاتا ہوں“

منٹو کے دو افسانے ٹیڈال کا کتا اور آخری سیلوٹ اس مالے کی تفسیر کے لیے پیش کیے جاسکتے ہیں منٹو کے ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہ خیال آیا کہ اس خطرناک موضوع پر مزید کہانیاں کہنے کی بڑی گنجائش ہے۔ لیکن یہ خطرہ مول کون لے گا؟ تو یہ خطرہ گلزار صاحب ہی مول لے سکتے تھے۔ منٹو غریب تو کمزور ہدف تھا جس کے جی میں آیا رگیدا، توڑا، پھینکا لیکن گلزار صاحب۔۔۔ سب کہہ بھی گئے اور کوئی بولا بھی نہیں۔

آمنے سامنے محاذ جنگ پر رہنے والے فوجی جن کے درمیان عجب Love اینڈ Hate والا رشتہ ہے اُدھر سے نپے کا ایک مصرعہ اٹھتا ہے جواباً دوسرا مصرعہ اُدھر سے آتا ہے۔ منٹو کے ہاں یہ بولیاں ہیر کی ہیں اور پھر وہ بولی:

جتنی لینی اے ستاریاں والی دے ہر نام سنگھا

بھانویں تیری مہنیں وک جائے

اور گلزار کے افسانے ایل۔ او۔ سی میں یہ معروف بولیاں:

دو پتر انا راں دے

ساڈی گلی لنگ ماہیا

حال پچھ جا بماراں دے

جواب سرحد کے اس طرف سے جاتا ہے:

دو پتر انا راں دے

پہرے نہیں ہڈ دے چناں

تیرے بھیڑے بھیڑے یاراں دے

کتنی معنی خیز بولیاں انتخاب کی ہیں۔ افسانے کے تھیم کی بھرپور علامتیں یعنی سب کہہ بھی گئے اور کہتے کہتے رہ بھی گئے۔ اس کی تفسیر اگر اوپر کہیں پتہ لگ جائے تو جذبول کا کورٹ مارشل ہو جائے۔ اس ایشو کی تاریخی سنگینی دیکھئے۔

”رکتے رکتے مجید نے بتایا۔“

”نیچے گاؤں میں بہت سے لوگ ہیں جن کے گھر اس طرف ہیں اور کھیتیاں اس طرف اسی طرح اس طرف بھی ایسے

ہی کچھ گاؤں ہیں جن کے گھر اور کھیت بٹے ہوئے ہیں خاندان بھی رشتہ دار بھی۔۔۔“

کشمیر کے حماد پر لڑنے والے بھارتی فوجی کی پاکستانی بہن عید قرباں کا گوشت پکا کر اپنے بھائی بھارتی کپٹن مجید کو پہنچاتی ہے۔ جس کا سر کمانڈر مشتاق احمد کھوکھر میجر کلونت سنگھ کا دوست ہے کلونت سنگھ گوشت کو مزے لے لے کر کھاتا ہے۔ لیکن پھر آخری سلیوٹ کے رام سنگھ کی طرح ادھر سے آئی گولی کا شکار ہو جاتا ہے اور دونوں فوجیوں کا اپنی ماؤں کو ملوانے کا خواب ادھورا رہ جاتا ہے جو تقسیم سے پہلے پکی سہیلیاں تھیں یعنی کلونت سنگھ کو گولی لگنا ان پرت در پرت رشتوں کو گولی لگنا ہے جیسے منٹو کے آخری سلیوٹ میں رام سنگھ کا مارا جانا، دوستی اور اعتماد کا مارا جانا ہے یہ موت ٹیٹوال کے کتا جیسی لالہ یعنی موت ہے۔ جس میں چڑھن جھن کا بے معنی جواب سپر سن سن ہے۔ جو جنگ جیسے بے مقصد عمل کی تضحیک ہے اور معنی آفرینی بھی کہ رام سنگھ یا کلونت سنگھ کی موت کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ مارنے والا اور مرنے والا شاید دونوں ایسا نہ چاہتے تھے لیکن حالات ایسے بنا دیئے جاتے ہیں کہ اُن سے یہ عمل سرزد ہوتا ہے۔ اب یہ عمل سرزد کروانے والے اور حالات کو اس نہج پر لانے والے کون اور کہاں ہیں یہ شاید مرنے اور مارنے والے دونوں کے علم میں کبھی نہیں آ سکتا۔ یہ ذاتی تفاخر، نسلی و علاقائی برتری کے حصول کا کھیل ہے۔ چند سر بھرے اپنے اپنے مقاصد کے لیے بنی نوع انسان کو جنگ جیسی قیامت کا ایندھن بنا دیتے ہیں یہ نقطہ ”اور“ میں بھی نمایاں ہے۔ جہاں دونوں اطراف کی فوجیں اور کراس فائرنگ ہار جاتی ہے اور سندھ دھرتی کا اشتراک جیت جاتا ہے جس کے دو سپوت گولی اور سلمان وزیر آغا کے فلسفے دھرتی پوجا کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ یہ کہانی اُردو کی بہترین کہانیوں میں انتخاب کی جانی چاہیے کہ ہر جملہ تاثیریت ڈرامائیت اور بھرپور طنزیہ ہے ایک بھرپور مضحکہ فہمہ اُس بچے کے جواب جیسا مضحکہ خیز جسے پاکستانی فوجی ہندوستانی گاؤں سمجھتے گڑھ پر قبضے کے بعد ایک گھر سے پکڑتا ہے اور فطری جذبہ ترحم کی بنا پر اسے ہندوستانی فوجیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے تو بچہ وہ جواب دیتا ہے۔ جو اس تاریخی مذاق کے منہ پر چائنا سا پڑتا ہے اور دونوں اطراف کے فوجی بیوقوفی کی حد تک بھونچکارہ جاتے ہیں جب وہ بتاتا ہے کہ وہ پاکستانی ہے اور سکول سے بھاگ کر ہندوستانی علاقے میں لڑائی دیکھنے آیا تھا۔ گویا یہ لڑائی بھی ایک کھیل تماشہ بندر اور بندریا کے روٹھے منہ جیسا۔

نئی دنیا کی بنیاد نسل پرستی، بنیاد پرستی، فرقہ پرستی اور دنیا پر حاکمیت کی شدید خواہش پر رکھی گئی ہے اگرچہ اسے نام تو دنیا  بنانے کا دیا گیا لیکن اس سوال کا جواب نیو ورلڈ آرڈر والے نہیں دے سکتے کہ ایک خطے  بنانا باقی پوری دنیا کو غلبہ  بنا دینے سے کیونکر مشروط ہو گیا اور پھر اس پورے منظر نامے پر تجارتی اسلحہ ساز کمپنیاں اور ان کے مفادات کس طرح غالب آ گئے، نائن الیون کے تناظر میں بہت کچھ سامنے آ چکا ہے عجیب بات تو یہ ہے کہ اس واقعے کے سارے تانے بانے چھوٹے سے ملک افغانستان سے جڑ جاتے ہیں جسے بدست ہاتھی نے بارود میں تبدیل کر کے ”دی سنون اتھ“ بنا دیا ہے۔ جس کے بارود کی بو اور انسانی چیتھڑوں اور بوٹیوں میں تبدیل ہونے کے منظر نامے کو گھڑا نے کچھ یوں موزوں کیا ہے:

اتنے سارے بازو ٹانگیں ہاتھ اور سر اور پاؤں

بچے  پرزے لگتے ہیں سپیئر پارٹز ہیں

ملک گیری کی ہوس وسائل کی چھینا جھپٹی طاقت کے غرور اور اسلحوں کی آزمائش نے بستیوں کے لمبوں تلے انسانی

جسوں کو بدبو مارتے کوڑا کرکٹ میں تبدیل کر دیا جسے صاف کرنے کو صفائی والے ٹرک آتے ہیں۔  
 ”آدھی پونی کئی سڑی لاشوں کے ڈھیر ٹرک میں گرنے لگے اور نصیر ایک کونے میں دبکا اُن کے نیچے پڑا رہا صفائی کی دکان پر ایسے ہی ادھ کٹے ادھ چھلے بکروں کے ڈھیر آیا کرتے تھے ٹھیلے میں لد کر۔۔۔“  
 ایسی ہی تصافی کی ایک دکان وادی کشمیر بھی ہے۔ اس کے دونوں اطراف رہنے والے ادیبوں شاعروں نے کشمیر میں پھیلی بدامنی دہشت و وحشت کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے جہاں کے حسین مناظر جل رہے ہیں وادی کے باسی ایک غم زدہ ماحول میں جینے پر مجبور ہیں لوگ اس تباہ حال معاشرے میں نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہیں۔ عزتیں، افراتفری، اجترائی اور مایوسی نے وادی کے حسن کو گھٹا دیا ہے۔ اس کی دلدوز چیخیں افسانہ ”تلاش“ میں سنائی دیتی ہیں۔ جہاں ہر پل قیدی اور ہر شخص بندی ہے۔ جامہ تلاشی کا شرمناک عمل انسانیت کی نگاہیں جھکا دیتا ہے۔ افسانے کا آخری منظر دیکھئے:

”تلاشی کو بس یہی ایک جگہ پہنچی تھی وہ بھی دیکھ لو۔۔۔“

یہ میں کیسے ملک میں آگئی ہوں یہ میرا ہی ملک ہے کیا۔۔۔

اور وہیں اپنی شلوار پر وہ ڈھیر ہو گئیں۔۔۔

آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔۔۔ کیا چاہیے ام سے۔۔۔ ام کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔۔۔ اب تو امارہ سبزہ بھی لال ہو گیا ہے۔ ہماری زمین کی گاس بھی لال ہو گئی ہے۔۔۔“

افسانہ ایک گولی کی طرح قاری کے بھیجے کو چیرتے ہوئے آرا پار گزر جاتا ہے۔ تلاشی کے نام پر عورتوں کی شرم گاہیں بھی پھرو لی جاتی ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ یہ مناظر آزادی سے پہلے قدرت اللہ شہاب کے افسانوں میں بھی اسی کراہت اور شرمناکی کے ساتھ موجود ہیں اور آج اکیسویں صدی کے دوسرے دیہائے میں بھی کشمیری اسی محکوم ماحول میں جینے پر مجبور ہیں۔ یہ الگ بات کہ اب ان کی کچلی ہوئی آواز گلزار جیسا کوئی ادیب ہی سن پاتا ہے ورنہ سبھی نے کانوں میں انگلیاں ڈھونس رکھی ہیں کیونکہ موت اور جبریت کے مناظر اتنے عام ہیں کہ لہو رنگ کشمیر دھندلا گیا ہے۔ اس سے اگلے مالے کا سرناواں ہے۔

ایک خیال نہ دکھتا ہے نہ چپ ہوتا ہے

ذہن کے سنائے میں اک جھینگر ہے بولتا رہتا ہے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب خود کش انسانی بمبار اس قدر عام نہ ہوئے تھے جس طرح آج کل ہمارے گلی کوچوں میں دندناتے پھرتے ہیں۔ اُن دنوں میں گلزار کی کہانی سوئبر پڑھی تھی۔ تو دم سادھے کئی گھنٹے اسی کے تاثر میں گم صم گزر گئے تھے۔ کیا انسان آلہ کار بن جاتا ہے ایک ٹول جس کے ذاتی جذبات و احساسات اور منشا اپنی ملکیت نہیں رہتے کسی آدرش یا پھر کسی عامل کے معمول بن جاتے ہیں۔ یہ کہانی انہی اندھے جذبوں کی کہانی ہے۔ یہ انسانی بمبار جو ایک لڑکی ہے اُس کے آخری دن کی روداد یا تصویر انہی جزئیات کے ساتھ کمال چابکدستی سے کھینچی گئی ہے۔ جس کے فلیش بیک میں وہ عوامل بھی موجود ہیں جو اُسے زندگی کے آخری لمحوں میں اتنا نارل اور پرسکون رکھتے ہیں کہ وہ کافی پتی ہے۔ غسل لیتی ہے اور معمول کی باتیں کرتی ہے۔ یہ کہانی برسوں بعد پڑھی تو کچھ چھپی ہوئی تہیں مزید نمایاں ہو گئیں۔

اچھے فن پارے کی یہی تو خوبی ہے کہ ہر عہد اور زمانے کے پس منظر میں مزید کچھ پوشیدہ سی معنویت عیاں کر کے وقت کا ہم رکاب بن جاتا ہے۔ جیسے اس افسانے کی اختتامی لائنیں:

”سورن سے ہار لیا اس نے اور سچ مچ ایسے پہنا یا جیسے سوئبر میں جیون ساتھی چن لیا ہوا ساتھ جئیں گے، ساتھ مریں گے ایک دھماکے کے ساتھ وقت پھٹا اور دونوں اتہاس میں داخل ہو گئے امر ہو گئے۔۔۔“

کسی حقیقی تاریخی واقعے کو اس قدر بھرپور افسانویت میں سمو دینا کہ کہیں مثالیت چھو کر بھی نہ گزرے اعلیٰ فنکار کی خاصیت ہے۔ یہ راجیو گاندھی کے قتل کی واردات ہے لیکن بیان بھرپور افسانہ ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ پر ہمیشہ جاری رہی ہے کہ فن پارہ اپنے تاریخی سماجی و سیاسی حالات سے کس حد تک جڑا ہوتا ہے یہ درست ہے کہ ادیب کو کسی خاص نظریے یا واقعہ پر ادب تخلیق کرنے کا پابند نہیں کیا جاسکتا ہے ادب معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بھی نہیں بلکہ ایک خلاق ذہن کا اظہار ذات ہے۔ لیکن اچھا ادب ایک پورے عہد اور معاشرے کو محیط ہوتا ہے اور ایک خوب تر معاشرے کو وجود میں لانے کی سرگرمی کا نام ضرور ہے لیکن ان زمینی حقائق یا تاریخی واقعات کا خارجی بیان یقیناً فن نہیں ہے بلکہ اطلاع یا اخبار کی خبر ہے۔ اس خبر کو کہانی بنانے کے لیے واقعے کے خارجی عوامل و تموجات سے انسان کے باطن میں جو تبدیلیاں یا مدو جزر پیدا ہوتا ہے کہانی اس داخلی فضا کو پیش کرتی ہے یوں کوئی فن پارہ زیرِ ضمیر رہنے والے جذبات و احساسات کو مس کرتا ہے اور داخلی صورتِ احوال کو سامنے لے آتا ہے راجندر سنگھ بیدی گربہن کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

”جب کوئی واقعہ مشاہدے میں آتا ہے تو میں اسے من و عن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اس کو احاطہ تحریر میں لانے کی سعی کرتا ہوں۔“ (۵)

لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اعلیٰ فن پارے کسی عہد کی جبریت، بد صورتی اور شر کے طلسم میں سے خیر کی روشنی کی طرح نمودار ہوتے اور اسی جبریت و نامعقولیت میں سے بہترین کردار تخلیق پاتے ہیں جیسے ”وداعی“ کا ”گورکھ پانڈے“، ”ٹھنیاں“ کا ”جھرو چاچا“ یہ کرداری افسانے ہیں دلچسپ کردار جنہیں معاشرے نے یہ عجیب اطوار اپنانے میں پوری مدد دی یہ تینوں افسانے ہمارے عہد کا چہرہ ہیں اس چہرے کا آئینہ گلزار نے ایسے زاویے سے دکھایا ہے کہ عکس خود تعبیر بن گیا ہے یہی ہے وہ نیا دور جس کے بنانے کا کریڈٹ جدید ترقی اپنے سر لیتی ہے۔ انسانوں کی کلوننگ کا عمل کیسا خوفناک ہے۔ نئے عہد کی جدید ترقی جہاں اصول کا عدے بڑا مذاق۔۔۔ عجیب زندگی اور اس سے بھی عجیب تر موت دونوں کے بیچ مابعد جدید انسان، یعنی لا انسان، گلزار نے اسی لا انسان میں انسانیت کا سراغ لگایا ہے اور خوب لگایا ہے کلوننگ کا منظر نامہ موقلم سے مصور ہو گیا ہے جس میں جدید ترقی کے نام پر سسکتی انسانیت عجب تماشا کہ انسان کا ترقی یافتہ ہونا فوق البشر ہونا کتنا ضروری ہے اسی لیے ساتویں مالے کا تعارفیہ ہے۔

” دوڑ دوڑ کے قدم ملتا ہوں

زندگی یہ کتنی تیز چلتی ہے“

زلزلے کے بلے تلے اٹھارہ روز موت کی پرسکون وادیوں میں سونے والے بخاری کو دنیا کی روشنیاں اور درد بیدار

کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے یہ کیا قیامت ہے کس دوزخ میں اٹھلائے ہو مجھے۔ شورٹ کٹ میں ہیرلز کا ڈرائیور جسے موت ملاقات کے لیے مشکل اور اوپر کھاڑ رستوں پر دوڑائے لیے جا رہی تھی کہ خاص لمحہ ملاقات متعین تھا وہ اگر راستے کے خطرات کا ادراک کر کے رفتار دھیمی کر دیتا تو موت کی دیوی کو انتظار کی کوفت نہ اٹھانا پڑتی۔ اسی لیے تو وہ مضبوط جیب کو بھی رفتار میں مات دیے جاتا ہے اور پھر جلد ہی ہزاروں میل نیچے نشیب میں منتظر کھری موت سے گلے ملنے کو پھلانگ جاتا ہے اس تیز رفتار زندگی میں موت کا رویہ بھی تبدیل ہوا ہے وہ بھی جدید اور سائنٹفک طریقے اپنانے لگی ہے وہ بھی گرہ مار گرہ کٹ کا کردار نبھانے لگی ہے۔

”سلطان کی آنکھیں اچانک خشک ہو گئیں ہاتھ کئی ہوئی جیب میں چلا گیا۔۔۔ کیا یا تو اس سے

بھی بڑا گرہ کٹ نکلا آپے گود بھری اُس کی آپے ہی جیب کاٹ لی۔“

گلزار کہانی کو عجیب ٹوسٹ دیتے ہیں۔ ایک ایسی دلیل ایسی منطقی کھوج گویا دل کی گرہ کاٹ کر سامنے رکھ دیتے ہیں کہ ایک معمولی واقعہ کی گہرائیوں، پہلو داریوں اور اچانک پن سے قاری بھونچکا سا رہ جاتا ہے اور پھر زیر لب زہر خندہ کرتا ہے یقیناً یہ کائنات ایک دلچسپ جرم ہے۔

جیسے کتھک سیکھنے والی گاگی کو اس گرہ کٹ نے ہڑپ لیا۔ سارے ڈاکٹر سارے علاج کسی سپر مین کے انتظار میں رہے لیکن سپر مین گاڈ جیسا نہ بن سکا کبھی سمجھ نہ آنے والے کبھی سلجھ نہ سکے والے مابعد الطبیعات جیسے عمل میں پتہ نہیں یہ انسان کس مقام پر کھڑا ہے چھوٹی سی لڑکی کی بڑی سی بات ملاحظہ کیجئے:

”پھر ڈاکٹر بدل لیے پاپا۔“

ہاں بیٹا اس ڈاکٹر سے کچھ نہیں ہو سکا۔ اس گاڈ سے بھی تو کچھ نہیں ہو پایا اور کوئی گاڈ نہیں ہے۔۔۔ پتہ نہیں کیوں اُس کے منہ سے نکلا وہ سپر مین کے جیسا ہے بیٹا کتابوں میں سب کر لیتا ہے۔“

اس انتہائی سنجیدہ اور فلسفیانہ نقطے کو بچوں کی فطرتوں کے پس منظر میں پیش کرنا شاید اسی طنزیہ کا حصہ ہے جو گلزار کی تحریر کا خاص وصف ہے اسی لیے جھٹے مالے کا عنوان ہے۔

بڑا ہونے لگا تھا پھر خیال آیا

میں پوچھوں تو سہی کتنا ضروری ہے بڑا ہونا

انسان اپنے بچپن کو اپنے بچوں میں پھر سے جیتا ہے اور انہیں اپنی آنکھوں سے بڑا ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے لیکن ایک طاقت ہے جو اس جدید ترقی یافتہ انسان سے بھی کہیں ترقی یافتہ ہے جو اس جدید سائنسی ترقی کا ہر حملہ روکنے کے لیے تیار رہتی ہے، جیسے ہی بیماریوں، مشکلوں کا علاج دریافت ہوتا ہے تو معلوم پڑتا ہے اس سے بھی ایک بڑا مرض آن کھڑا ہوا ہے جس کا علاج دریافت ہونے کا درمیانی وقفہ بے شمار زندگیوں کو کھا جاتا ہے کینسر بھی اسی درمیانی وقفے کا بے تاج شاہ ہے جو ایٹمی راج بھومی میں کسی بڑے یا نیچے کی تمیز نہیں کرتا ہے۔

کہانی کو ایسا شارپ ٹوسٹ دینا ایسا ہلا دینے والا اینڈنگ کہ آنکھیں چاہے پتھرا جائیں لیکن پھر بھی بہت دور تک دیکھنے کی صلاحیت ضرور حاصل کر لیں۔ اسی لیے گلزار کے اکثر افسانے ایک سوالیہ پر اختتام پذیر ہوتے ہیں جو ایک اُن دیکھی اُن جانی دنیا کا دروازہ ہوا کرتے ہیں۔ اب قاری کا حوصلہ کہ وہ اس دنیا کو کھوجنے دیکھنے بھالنے کی ہمت کرے



دروازے پر تو لا کھڑا کیا گیا ہے ہر ڈیوڑھی کا دروازہ کسی پر اسرار دنیا پروا ہوتا ہے۔ جہاں ماموں اپنا سپیس کرافٹ لے کر لوٹے تو زمین کا ماحول دھواں ہی دھواں تھا ساری زمین کھوڑوں سے بھر گئی تھی کبھی کبھی یہ افسانے ایسٹریکٹ آرٹ کا نمونہ معلوم ہونے لگتے ہیں جس میں لا انسان کیڑے کھوڑوں، کاکروچوں اور چھپکلیوں میں قلب ماہیت کر چکا ہے۔ لیکن اس ڈیوڑھی کا آخری مالے کھوپکے انسان گم ہو چکی انسانیت کی پھر سے تلاش کا عمل ہے جہاں دل کی لگی دل کو لگ گئی اور ذرا سی معمولی سی بے توجہی محبت کے پودے کو سوکھا کر کھا گئی اسی لیے تو نام کی تختی آویزاں ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرا  
آری سے کٹتے نہیں نا بھی کے رشتے

لالہ جی بوڑھیا لالائن کے بال کٹوانے کا صدمہ تو برداشت کر ہی جاتے لیکن ان عزیز از جان بالوں کو کٹوانے سے پہلے لالائن نے لالاجی سے ایک بار پوچھنا بھی گوارا نہ کیا۔ پھول کی پتی نے ہیرے کا جگر ادھیر کر رکھ دیا۔  
”باتیں بڑی معمولی ہیں بیٹا نا ہونے سے کوئی دنیا ادھر کی ادھر نہیں ہو جاتی لیکن زندہ رہنے کا رس بنا رہتا ہے بس۔۔۔“ یہی رس ہے جو اپنی شدت میں ایڈجسٹ منٹ ہو جاتا ہے۔ نانا کو خود میں ہی نانی کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ یعنی:

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی  
سدو نی مینوں دھیدو ہیر نہ آکھو کوئی

گلزار کی اس ڈیوڑھی کے آٹھوں دالان ایک الگ حیرت ناک اور دلچسپ دنیا پر جا کر کھیلنے ہیں۔ موضوعات کی رنگا رنگی اور خیال کی منفرد بنت کو اسلوب کی چاشنی نے اپنے پانیوں سے نتھارا ہے تشبیہات و استعارات نے دانش اور جدید افکار کو حسیات کے رس میں بھگوایا ہے۔ الفاظ کے نئے ڈانکے مختلف زبانوں کا آمیزہ مثلاً سندھی، بنگالی، میراثی، پنجابی، ممبئی بولی اتنے منفرد مزے کہ زبان چٹکارے لیتی ہے۔ موزوں مصرعوں کی ڈیوڑھی سے گزر کر دالان او راگن الاگو تو اندرونی کوٹھریوں تک راستہ جاتا ہے۔ جہاں پرانی پیٹیوں میں یادوں کے لحاف بند پڑے ہیں، اسرار کے نیکیے لگے ہیں۔ رازوں کی تلائیاں گف ہیں اور حقائق کی دیک بھی لگی ہے۔ یہ کہانیاں اُس بند صندوق سی باشا دیتی ہیں جسے سرما کے سرد بھیگے موسموں کے گزر جانے کے بعد دھوپ میں پھیلاؤ تو کبھی تمباکو کی مدھوش کر دینے والی خوشبو کبھی نیم کے پتوں کی کڑوی مہک کبھی فنانل کی گولیوں کی نشیلی باشا زمین کے اوپر ہی اوپر عجب جھولا سا جھلاتی ہے۔

گلزار کی ہر کہانی میں محسوس ہوتا ہے مصنف اس موضوع کے ساتھ ایک لمبا عرصہ جیئے ہیں اسے خود پر سے بسر کیا ہے۔ اگرچہ موضوع کی عظمت اعلیٰ ادب پیدا نہیں کرتی بلکہ ادیب کی ہنرمندی، چابک دستی، تکنیکی بصیرت اور فنی عوامل کی سلیقہ مندی کسی تحریر کو ادب میں اس کا جائز مقام دلاتی ہے لیکن یہ تکنیکی مہارت اور فنی بصیرت بھی اُسی وقت کام آتی ہے جب موضوع یا فن پارے کے مواد کے ہمراہ ادیب نے ایک عرصہ بسر کیا ہو معلوم ہوتا ہے گلزار نے اس ڈیوڑھی کے ہر مالے پر جسم و جاں کے کئی پرزے بکھیرے ہیں۔ خون جگر کے کئی جام پیئے ہیں تو پھر ڈیوڑھی جیسا فن پارہ تخلیق ہوا ہے اور بات خود گلزار کی زبانی یوں تمام ہوتی ہے، جیسے بخارہ روئی دھنٹا ہے میں کہانی دھنٹا رہا جس کا جی چاہے اپنے نیکیے تلائیاں بھر لے۔“ (۶)

### حوالہ جات

- ۱۔ انتظار حسین، فلیپ دھواں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء
- ۲۔ گوپی چند نارنگ، گلزار کہانیوں میں زندگی کی کتاب، ایضاً، ص ۱۹
- ۳۔ گلزار، افسانے کی کہانی، ایضاً، ص ۱۹
- ۴۔ گلزار، ڈیوڑھی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۶۸
- ۵۔ راجندر سنگھ بیدی، گرہن، لاہور: نیا ادارہ اشاعت اڈل، ۱۹۳۲ء، ص ۹
- ۶۔ گلزار ڈیوڑھی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۱۳ء، ص ۱۶